رسائل و مسائل

وحی، نبوت، سنّت اور حدیث

سوال (۱) وحی کے نزول کی حقیقت کیا ہے اور اس کا عنوان کیا رہا؟ "مایوحیٰ" اور "ما انزل اللہ" کیا ہے؟

(۲) نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم دین الٰہی میں تبع قرآن مجید تھے یا اپنی خواہش و رضا سے بھی حکم دیتے تھے اور آیا آپ احکام قرآنی کو کم و بیش کرنے، حدود اللہ کو توڑنے، حلال و حرام کی فہرست گھٹانے اور بڑھانے کے بھی مجاز من اللہ تھے یا نہیں؟

(۳) نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاء نے دین الٰہی کی تبلیغ کس کتاب کے ذریعہ سے کی اور کونسی کتاب ان کی دستور العمل رہی، اور ان کی یہ تبلیغ ناقص تھی یا کامل، اگر تبلیغ کامل کرنے کے لیے حدیث کی بھی تبلیغ کی گئی تھی تو صحابہؓ کو کل حدیثیں پہنچی ہوئی تھیں یا نہیں اور تبلیغ بھی کی گئی تھی تو وہ تبلیغ شدہ کتاب کہاں ہے — اور اگر پہنچی ہوئی نہ تھیں اور تبلیغ بھی نہ ہوئی تھی تو کیا تبلیغ ناقص کی گئی، اور اس صورت میں تبلیغ کامل کرنے کے لیے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجتماع حدیث کے لیے کیا اہتمام کیا۔ اور اگر کوئی اہتمام نہ کیا تو کیا تبلیغ کی تکمیل اجتماع حدیث تک دو سو برسوں کے لیے ملتوی رہی، اور کیا رسالت کا کام ناتمام رہا، اور مسلمان اطیعوا الرسول کے نافرمان رہے؟

(۴) حضرت رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا تھا یا منع فرمایا تھا اگر حکم دیا تھا تو خود آپ کے زمانہ باسعادت میں اس کی تعمیل کیوں نہ کی گئی — اور اگر منع فرمایا تھا تو یہ بدعت کس نے نکالی — اور کب نکالی — اور حدیث کے ساتھ خلفائے راشدین اور صحابہ کا کیا سلوک رہا اور ان کی حقیقت کیا ہے؟

(۵) قرآن مجید مجمل ہے یا مفصل — کامل ہے یا ناقص — محتاج تفسیر ہے یا نہیں —

اگر محتاج تفسیر ہے، تو رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے، یا خلفاءؓ نے یا صحابہؓ نے ——— کوئی تفسیر لکھی یا لکھوائی یا نہیں ——— نہیں لکھی تو قرآن مجید کو مجمل ناقابل عملدرآمد کیوں چھوڑا - یہ تبلیغ دین کی تکمیل کی خدمت جو سب کاموں سے خلافت کے جھگڑوں، اور فتح مصر و شام سے بھی مقدم تھی ترک کیوں کی گئی، درانحالیکہ ختم نبوت کے بعد کوئی نبی آنے والا بھی نہیں جو قرآن مجید کے اجمال کھولے - اور اگر قرآن مجید مجمل اور محتاج تفسیر نہیں ہے - تو مجمل اور محتاج تفسیر بالاتفاق کیوں تسلیم کیا جاتا ہے، آیا کسی آیت کی رُو سے یا کسی حدیث مرفوع متصل کی رُو سے، یا کسی عالم کے کہہ دینے سے ؟

(۶) منکرِ حدیث کسے کہتے ہیں ؟ کیا قرآن مجید اور عقلِ سلیم کی روشنی میں حدیث کا انکار کرنے والا منکرِ حدیث کہلائے گا ؛

جواب (۱) وحی کے نزول کی حقیقت قرآن حکیم میں وحی کے اقسام بتاتے ہوئے اس طرح بیان کی گئی ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ، أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ۔ (شوریٰ - ۵۲)	اور کسی انسان کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ، یا پردے کے پیچھے سے یا رسول (فرشتہ) بھیجے۔ پھر اس کے ذریعہ وحی فرمائے جو چاہے۔ بلاشبہ وہ بلند و بالا اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں وحی کی پہلی قسم کو لفظِ وحی سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی بلا کسی واسطہ کے اللہ تعالیٰ پیغمبر کے دل میں کوئی بات ڈال دیتا ہے۔

دوسری قسم "من وراءِ حجاب" کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اپنے رب سے ہم کلام ہوئے تھے۔

تیسری قسم کو ارسالِ رسول سے واضح کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ نبی کو اپنے احکام سے مطلع کر دے۔

حدیث میں انبیائے کرام کے خواب بھی وحی قرار دیئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ کی نمایاں مثال حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا وہ خواب ہے جس میں انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ حدیث میں پہلی قسم کے نزول کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

آپ فرماتے ہیں "پہلے جرس کی سی آواز سنائی دیتی ہے، میں خاموش ہو کر ہمہ تن گوش ہو جاتا ہوں، وحی کو سنتا ہوں اور یاد کر لیتا ہوں بعض حالات میں ایسی شدت کی تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ بس معلوم ہوتا ہے کہ اب دم گھٹ جانے والا ہے" (مسند احمد)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک متغیر ہو جاتا تھا، آپ سر جھکا لیا کرتے تھے، سخت سردی کے زمانہ میں موتی کی طرح پسینے کے قطرے آپ کی پیشانی سے ڈھلکنے لگتے تھے۔

ما یُوحیٰ اور ما انزل اللہ سے قرآن اور سنت دونوں مراد ہیں۔

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کے متبع تھے، یہ وحی قرآن و سنت دونوں پر مشتمل تھی۔ اس میں آپ کی خواہش کا کوئی دخل نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکامِ الٰہی کو نافذ اور حدود اللہ کو قائم کرنے کے لیے تشریف لائے تھے نہ کہ ان کو کم و بیش کرنے یا توڑنے کے لیے۔ اس لیے یہاں اس قسم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں یہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی خفی (سنت) کے ذریعہ قرآن مجید کے معانی اور مصداق کو متعین فرمایا، اور قرآنی اصول و ضوابط کی روشنی میں حلال و حرام کی ایسی فہرست بھی آپ نے امت کو بتائی جو قرآن میں صراحۃً مذکور نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے آپ کے اس منصب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ ۔ (اعراف۔ ۱۵۸)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھیراتے ہیں اور خبیث (گندی) چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔

(۳) اس سوال کے پیچھے دراصل یہ ذہن کام کر رہا ہے کہ عہد نبوی اور صحابہ کرام کے دور میں تو احادیث کا نام و نشان بھی نہ تھا، یہ تو دو سو سال کے بعد وجود میں آئیں، اور یہ کہ جو دینی سرمایہ کتابی شکل میں مدون نہ ہو اس پر عملدرآمد کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اصل معاملہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے

کتاب و سنت ہی کے ذریعہ دین کی تبلیغ کی، اور یہ دونوں ان کے لیے دستور العمل بنیں، یہ تبلیغ اپنی جگہ کامل و مکمل تھی، یہ ضروری نہیں ہے کہ جس شئے کی تبلیغ کی جائے وہ کتابی شکل میں مرتب شدہ بھی ہو۔

ظاہر ہے کہ قرآن حکیم ۲۳ سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا اترتا رہا۔ اور عہدِ رسالت کے آخری لمحات میں لوگوں نے اُسے مرتّب شکل میں اپنے کانوں سے سُنا اور دوسروں تک پہنچایا، لیکن کیا اس وقت وہ مکمل طور پر کتابی شکل میں موجود تھا؟ کتابی شکل میں جمع و ترتیب کا کام حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں انجام پایا۔ جمع قرآن کے اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے کیا یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ حکیم کی تبلیغ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت یا عہدِ نبوی کے آخری لمحات ہی میں جائز تھی، اس سے قبل نہیں؟

اُس دورِ سعادت کا تو یہ حال تھا کہ جب کوئی آیت اترتی تو صحابۂ کرام خود بھی اس پر عمل کرتے اور دوسروں تک پہنچانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ یہی طرزِ عمل ان کا حدیثِ نبوی کے ساتھ تھا۔

حدیث کے جمع و ترتیب کے تین دَور ہیں:۔

(۱) پہلا دور عہدِ نبوی اور صحابہ و تابعین کے زمانہ پر مشتمل ہے۔ یہ دَور سنہ ۱۰۰ھ تک ختم ہوتا ہے۔ اس دَور میں احادیث کے لکھنے اور جمع کرنے کا حکم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دیا اور صحابہ کرام نے بھی اس کا اہتمام کیا۔ اس سلسلہ کی مثالیں تو بہت سی ہیں۔ یہاں صرف چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) فتح مکہ کے وقت ابوشاہ یمنی کی درخواست پر آپ نے اپنا خطبہ قلم بند کرنے کا حکم فرمایا۔ یہ خطبہ نہایت اہم فقہی احکام پر مشتمل تھا۔ (صحیح بخاری۔ ج ۱۔ باب کتابۃ العلم، مسلم ج ۲۔ باب تحریم مکہ)۔

(۲) صحیفۂ علیؓ۔ اس میں حرمتِ مدینہ، دیت، جراحات اور اہلِ ذمہ کے احکام درج تھے۔ (بخاری۔ مشکوٰۃ کتاب القصاص ص ۳۰۰)

(۳) رافع بن خدیج کو آپ نے احادیث لکھنے کا حکم فرمایا۔ (منتخب کنز العمال ج ۴۔ ص ۵۸)۔

(۴) عمرو بن حزم کے ذریعہ آپ نے اہلِ یمن کو ایک مفصل کتاب ارسال فرمائی جس میں بہت سے فقہی احکام درج تھے (مشکوٰۃ۔ باب الدیات ص ۳۰۳۔ مؤطا امام مالک ص ۳۳۲۔ الاستیعاب ج ۲، ص ۴۳۷)

(۵) صحیفۂ صادقہ۔ یہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کا مرتب کیا ہوا تھا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: اکتب کل ما اسمع منک قال نعم (جامع بیان العلم ج ۱ ص۷۲)۔
یعنی "کیا جو کچھ میں آپ سے سنوں اُسے لکھ لوں؟ آپ نے فرمایا، ہاں"۔

(۶) حسن بن عمرو کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت ابوہریرہؓ نے ہمیں بہت سے قلمی نوشتے دکھلائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل تھے۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص۷۴)۔

(۷) ابو عبید خیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی پہنچا۔ جس میں آپ نے مردار سے منع فرمایا تھا۔ (الاستیعاب لابن عبد البر ج ۲ ص۲۱۳)۔

اس نوع کے بہت سے نظائر و شواہد حدیث کے مستند ذخیرے میں موجود ہیں۔ یہاں صرف انہی چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ایک انصاف پسند طالب حق کے لیے یہی واقعات کیا کچھ کم ہیں!

(۲) دوسرا دور سنہ ۱۵۰ھ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں امام ابن شہاب زہری کا نام تدوین حدیث کے سلسلہ میں نمایاں طور پر لیا جاتا ہے جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تدوین حدیث کا حکم دیا تھا۔

دوسرا نمایاں نام امام مالکؒ کا ہے جن کی شہرۂ آفاق تصنیف مؤطا امام مالک ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا زمانہ سنہ ۱۴۳ھ کے لگ بھگ متعین کیا جاتا ہے۔

(۳) تیسرا دور تیسری صدی ہجری کے بعد تک قائم رہا۔ اس دور میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور روایات کے دوسرے مجموعے مرتب ہوئے۔

پہلے دور کے راویوں نے زیادہ تر اپنی ذاتی یادداشتیں قلم بند کرنے پر اکتفا کی۔ ان کے یہ نوشتے دوسرے دور کے جامعین حدیث کے لیے بنیاد بنے۔ اس عہد کے اہل علم نے اپنی ذاتی یادداشتوں کے ساتھ ساتھ اپنے شہر اور قریبی علاقوں کے راویوں سے حاصل شدہ ذخیرۂ روایات کو بھی اپنے مجموعوں میں سمو لیا۔

تیسرے دور میں جمع حدیث کا فن اور بھی وسیع ہو گیا۔ محدثین شہر شہر اور قریہ قریہ گھومے، دور دراز کی منزلیں طے کیں، صحراؤں، وادیوں کی خاک چھانی اور ایک ایک حدیث کا کھوج لگایا، جانچ پڑتال کی

اس طرح دوسرے دور کا سرمایہ حدیث تیسرے دور کی تصانیف میں سما گیا۔

"تدوینِ حدیث کے اس پورے پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ" کیا تبلیغ کی تکمیل اجتماعِ حدیث تک دو سو برس کے لیے ملتوی رہی؟"

(۴) حدیث کے لکھنے اور جمع کرنے کے بارے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طرزِ عمل کی وضاحت سوال ۳ کے جواب میں کردی گئی ہے۔ باقی رہا کتابتِ حدیث سے ممانعت کا حکم تو اس کی پوری تفصیل صحیح مسلم کی روایت میں ملتی ہے۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار	ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے قرآن کے علاوہ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ لکھا ہے اُسے مٹا دے، مجھ سے حدیث بیان کرو تو کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے مجھ پر جانتے بوجھتے جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔

(مسلم۔ کتاب الزہد۔ ج ۲ ص ۴۱۴)

عام طور پر منکرینِ حدیث اس روایت کا پہلا اور دوسرا فقرہ تو بڑے زور شور سے پیش کرتے ہیں لیکن تیسرے فقرے کو بالکل پی جاتے ہیں۔

اوّلاً، یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس روایت میں کتابتِ حدیث کی ممانعت سے یہ کہاں لازم آیا کہ حدیث دینی حیثیت بھی نہیں رہے، جبکہ اس کے متصل ہی "حدثوا عنی ولا حرج" موجود ہے۔

ثانیاً، آپ کا یہ حکم وقتی اور عارضی تھا نہ کہ دائمی اور مستقل۔ مصلحت یہ تھی کہ اگر ابتدائی دور میں قرآن و سنت دونوں کے قلم بند کرنے کا رواج عام ہو گیا تو قرآن و حدیث کے مابین امتیاز نہ ہو سکے گا۔ اس وقت بعد کے زمانہ کی طرح کاغذ اور کتابت کی سہولت نہ تھی۔ لوگ عام طور پر ہڈیوں، پتھر کی سلوں اور صاف ستھرے چمڑوں پر لکھا کرتے تھے۔ کاتبوں کی تعداد بھی بہت ہی کم تھی۔ اس بنا پر قرآن و سنت دونوں کی

کتابت و ترتیب کا اہتمام اس شکل میں تقریباً ناممکن تھا کہ دونوں کے درمیان پوری طرح امتیاز برقرار رکھا جاسکے۔ آپ کے اس حکیمانہ ارشاد سے ایک طرف قرآن حکیم کی امتیازی شان اپنی جگہ برقرار رہی، دوسری طرف سنت کی ایک الگ حیثیت بھی واضح ہو گئی۔

خلفاء راشدین اور تمام صحابہ کرام حدیث کو دینی حجت سمجھتے تھے جیسا کہ ذیل کے شواہد امثلہ سے ظاہر ہے

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب دورِ صدیقی میں حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباس نے اپنے اپنے حصے کا مطالبہ کیا (بخاری پ ۲۷)۔ اور ازواج مطہرات نے حضرت عثمانؓ کے ذریعہ اپنا حق وراثت طلب کیا (بخاری و مسلم)۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے سب کو ایک ہی حدیث سنا کر مطمئن کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "لَا نُوْرَثُ مَا ترکنا صدقۃ" یعنی انبیاء کرام کا متروکہ مال میراث کے طور پر تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ وہ امت کے غرباء کا حق ہے۔ (بخاری و مسلم۔ مشکوٰۃ ص ۵۵۰)۔ حضرت فاطمہ جنہوں نے اس مطالبہ پر اصرار کیا تھا بعد میں راضی ہو گئیں۔ (بیہقی ج ۶ ص ۳۰۱)

(۲) حضرت ابوبکرؓ سے جب دادی کے حق کے بارے میں سوال کیا گیا، کہ وہ اپنے پوتے کی میراث میں سے کتنا حصہ لے گی؛ تو حضرت ابوبکرؓ نے اس بارے میں صحابہؓ سے دریافت کیا، محمد بن سلمہؓ اور مغیرہؓ بن شعبہ نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ (موطا امام مالک، ص ۳۲۷۔ باب میراث الجدۃ)

(۳) حضرت عمرؓ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مقتول شوہر کی دیت سے اس کی بیوی حصہ پائے گی یا نہیں؛ حضرت عمرؓ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اس موقع پر ضحاکؓ بن سفیان حضرت عمرؓ سے کہتے ہیں کہ میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نوشتہ موجود ہے کہ آپ نے اشیم ضبابی کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت میں سے حصہ لینے کا حق دار ٹھیرایا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلے سے رجوع فرمایا اور اس حدیث کے مطابق فیصلہ دیا۔ (ابوداؤد۔ موطا امام مالک ص ۳۲۹ باب میراث العقل)

(۴) حضرت عثمانؓ کا خیال تھا کہ جس عورت کا شوہر مر جائے تو وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے لیکن جب ابوسعید خدری کی بہن فریعہ بنت مالک نے اپنا واقعہ پیش کیا کہ میرا شوہر قتل کیا گیا تھا،

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے شوہر کے مکان پر عدت گذارنے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت عثمانؓ نے اسی روایت کے مطابق فیصلہ کیا۔ (موطا امام مالکؒ مطبع مجتبائی دہلی ص۲۱۷۔ باب مقام المتوفی عنہا زوجہا)۔

(۵) حضرت علیؓ کے پاس چند مرتد افراد لائے گئے۔ آپ نے ان کے آگ میں جلا ڈالنے کا حکم دے دیا۔ حضرت ابن عباس نے حدیث پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من بدل دینہ فاقتلوہ یعنی مرتدین کا خاتمہ تلوار سے کیا جا سکتا ہے نہ کہ آگ میں جلا کر۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا صدق ابن عباس، یعنی حضرت ابن عباسؓ نے سچ بات کہی ہے۔ (ترمذی ابواب الحدود ص۱۷۶۔ مطبع مجتبائی دہلی)۔

حدیث سے استناد و احتجاج کے سلسلہ میں بہت سے شواہد و نظائر پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن ایک حق پسند انسان کے لیے مندرجۂ بالا واقعات ہی ذہنی اضطراب دور کرنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔

(۵) قرآن مجید اپنی کاملیت کے باوجود مجمل بھی ہے اور مفصل بھی۔ مفصل اس طرح کہ قرآن حکیم نے دین کے اصول و مبادی اور شریعت کے مہماتِ امور کو تفصیل سے اور بہ تکرار بیان کیا ہے۔ اور مجمل اس بنا پر کہ عام طور پر شریعت و قانون کی تفصیلی جزئیات و تعریفات کی الگ الگ وضاحت کی بجائے شریعت کے صرف اہم اور بنیادی اصولوں کے بیان کر دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ علامہ شاطبی لکھتے ہیں: القرآن علی اختصارہ جامع ولا یکون جامعاً الا والمجموع فیہ امور کلیات (الموافقات ج ۳ ص۳۶۵) "قرآن اختصار کے باوجود اپنے اندر جامعیت رکھتا ہے، اور جامعیت محض اس بنا پر ہے کہ اس میں کلی اور اصولی امور کا بیان ہے"۔

انہی کلی امور کی تشریح و وضاحت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے فرمائی ہے۔ توضیح مدعا کے لیے یہاں تین مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں حکم ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ لیکن اقامت صلوٰۃ کی کیفیت کیا ہو گی اس کی پوری

وضاحت ہم کو حدیث میں ملتی ہے۔

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ ..... (توبہ - ۳۴)۔ یہ آیت اپنے عموم کی بنا پر کم یا زیادہ ہر صورت میں مال کے جمع کرنے پر وعید سناتی ہے۔ صحابہ کرام نے اس بارے میں اضطراب سا محسوس کیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اضطراب کو یہ فرما کر دُور کر دیا، اِن اللّٰہ لم یفرض الزکوٰۃ الا لیطیب بھا مابقی من اموالکم، فکبر عمرؓ۔ (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ ص۱۵۶)۔
" بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی ہے مگر اسی لیے کہ وہ اس کے ذریعہ بقیہ مال کو پاک کر دیتا ہے، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے خوشی کے مارے نعرۂ تکبیر بلند فرمایا"

(۳) قرآن حکیم نے عہدِ نبوی کے بعض اہم واقعات کو حسبِ ضرورت نہایت مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ حدیث نے ان واقعات کی پوری تفصیل اور پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وَعَلَی الثَّلٰثَۃِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا .... (توبہ - ۱۱۸) - اس واقعہ کی تمام جزئیات ابوداؤد، ترمذی اور حدیث کی دوسری مستند کتابوں میں ملتی ہیں۔

ان تمام تفصیلات کو دینی حیثیت دے دینے سے کوئی صاحبِ فہم یہ باور نہیں کر سکتا کہ قرآن ناقص ہے یا یہ کہ اس کی کاملیت خطرہ میں پڑ گئی ہے۔

قرآن حکیم نے خود سنت کو واجب العمل قرار دیا ہے اور اس کی دینی حیثیت کو متعدد آیات میں نمایاں کیا گیا ہے۔ یہاں صرف دو آیتیں نقل کی جاتی ہیں:۔

(۱) وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (نحل - ۴۴) "اور ہم نے آپ کی طرف ذکر اُتارا ہے تاکہ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اُسے لوگوں کو کھول کھول کر بتا دیں"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت نعوذ باللہ محض چٹھی رسان کی سی نہیں ہے بلکہ اپنے قول و عمل سے اس کے ایضاح و تبیین کی ذمہ داری بھی آپ پر ڈالی گئی ہے۔ اور وہ بھی اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے قصورِ فہم کا لحاظ فرمایا نہ کہ اس وجہ سے کہ قرآن خود ناقص ہے۔

(۲) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ، فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ (نساء) "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی، پھر اگر کسی معاملہ میں آپس میں نزاع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔" اس آیت میں لفظ "اللہ اور رسول" سے پہلے اطیعوا بار بار لایا گیا ہے، لیکن اولی الامر سے قبل لفظ اطیعوا کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ اولی الامر کی اطاعت عارضی اور غیر مستقل ہے، لیکن اللہ اور رسول کی اطاعت قیامت تک کے لیے لازمی اور دائمی ہے۔

واجب الاتباع، دینی حجت، اور آخری سند ہونے کی حیثیت سے دونوں اپنی اپنی جگہ پر مستقل اور جداگانہ ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔

جس طرح اللہ کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کا کلام، قرآن کی اطاعت مراد ہے اسی طرح رسول کی اطاعت سے مراد رسول کے اقوال و افعال و سنت کی اطاعت ہے۔ اگر اطیعوا الرسول سے مراد بھی قرآن ہی کی اطاعت ہے، تو پھر لفظ " اطیعوا اللہ" اس مفہوم کو ادا کر ہی رہا ہے، اطیعوا الرسول کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

(۶) حدیث کو بطور دینی حجت ماننے سے انکار کرنے والا منکرِ حدیث کہلاتا ہے۔

باقی رہا جو شخص دیانتدارانہ طور پر اپنے فہم و بصیرت سے روایات کے وسیع ذخیرے میں سے کسی ایک یا چند روایات کو اس بنا پر قبول نہیں کرتا کہ وہ اصولِ روایت یا اصولِ درایت کے خلاف ہیں تو اُسے منکرِ حدیث نہیں کہا جا سکتا۔ اس بارے میں حافظ ابن القیمؒ کی تحقیق اپنی جگہ پر نہایت معتدل اور منصفانہ ہے:۔

" ان من رد الخبر الصحیح اعتقاد الغلط الناقل او کذبه او لاعتقاد الراد ان المعصوم لا یقول هذا، او لاعتقاد نسخه او نحوه فردّه اجتهاداً او حرصا علی نصرة الحق فانه لا یکفّر بذالك ولا یُفَسَّق، فقد رد غیر واحد من الصحابة بعض الاخبار الصحیحة، کما رد عمر حدیث فاطمة بنت قیس فی اسقاط نفقة المطلقة ثلاثا وکما ردت عائشة حدیث ابن عمر فی تعذیب المیت

ببکاء اھلہٖ علیہ وغیر ذالك " (صواعق مرسلہ ج ۲ ص ۳۷۰) ۔

یعنی " اگر کسی روایت کو کوئی شخص اس اعتقاد کی بنا پر رد کر دے کہ راوی کی غلطی یا کذب بیانی کے قرائن موجود ہیں یا اس اعتقاد کی بنا پر کہ معصوم ہستی ایسا حکم نہیں دے سکتی، یا وہ اُسے منسوخ قرار دیتا ہے یا اس قسم کی اور کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ اپنے اجتہاد اور نصرتِ حق سے والہانہ شیفتگی کی بنا پر اس روایت کو ناقابلِ قبول ٹھہراتا ہے، اس کی تکفیر یا تفسیق نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ ایک سے زیادہ صحابہ نے بعض صحیح روایات کو قبول نہیں کیا ہے۔ مطلقہ ثلاثہ کے نفقہ کے بارے میں فاطمہ بنت قیس کی روایت کو حضرت عمرؓ نے قبول نہیں کیا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے، حضرت عائشہ کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔"

یہاں یہ بات واضح رہے کہ کسی صحیح السند خبرِ واحد کو قرآن یا درایت کے خلاف ہونے کی بنا پر رد کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ نہایت ہی اہم اور ذمہ داری کا کام ہے، اس کا حق انہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دیانت و تقویٰ کے ساتھ قرآن اور سنت کے مستند ذخائر کے گہرے مطالعہ میں گذار دیا ہو۔

عبدالغفار حسن